یونیورسٹی سے کتابیں نہیں آئی؟ قریبی مارکیٹ میں بھی کتابیں دستیاب نہیں؟
تو Aamir Khan کی ہوم سروس کے ذریعے اسائنمنٹ اور امتحانات کی مکمل
تیاری کے لیے ابھی گھر بیٹھے کتابیں حاصل کریں۔کتب کی Printed
قیمت کے علاوہ مزید ڈاک خرچہ 300 روپے ادا کر کے کتب کا آرڈر کریں۔
ایڈمیشن میں سب سے بہتر رہنمائی کے لیے رابطہ کریں Aamir Khan Aiou
03349557527
03349557527 جازکیش کے ذریعے
ابھی گھر پر کتابیں حاصل کریں

Semester Spring 2021

Course Code 417

Solved paper STE autumn 2020

English

SUBSCRIBE Aamir Khan Aiou

Aamirkhanaiou1.blogspot.com

Marks	Question	Sr. No
33	مسلم معاشرے کی اصلاح کے لیے مجدد الف ثانی اور شاہ ولی اللہ کی تعلیمات کے کیا اثرات مرتب ہوئے؟ ان تحریکوں اور موجودہ دور کی اصلاحی تحریکوں میں کیا مماثلت ہے؟ وضاحت کریں۔	1
33	مسلمانوں پر برطانوی حکومت کا اعتماد بحال کرنے کے سلسلے میں سرسید کی کیا تعلیمی، معاشرتی اور سیاسی خدمات ہیں؟ کیا آج کے دور کی اصلاحات، سرسید کی اصلاحات سے متاثر ہیں؟ تنقیدی جائزہ لیں۔	2
34	قائداعظم اور علامہ اقبال کا قومی سیاست میں کیا کردار رہا؟ کیا آج کا پاکستان قائداعظم کا پاکستان ہے؟ اگر ہے تو کیسے؟ اگر نہیں تو اس کی بہتری کے لیے کن اقدامات کی ضرورت ہے۔ بحث کریں۔	3

سوال نمبر 1:

جواب:

مجدد الف ثانی

شیخ احمد سرہندی المعروف مجدد الف ثانی (مکمل نام:شیخ احمد سر ہندی ابن شیخ عبد الا حد فاروقی) (پیدائش: 26 وفات: 10 دسمبر 1624ء) دسویں صدی ہجریکے نہایت ہی مشہور عالم و صوفی تھے۔ جو مجدد —جون 1564ء الف ثانی اور قیوم اول سے معروف ہیں۔[1] آپ کے مشہور خلیفہ سید آدم بنوری ہیں۔

زندگی
آپ کی ولادت جمعۃ المبارک 14 شوال971 ھ (یہی خواجہ باقی باللہ کا سال ولادت ہے عجیب اتصال روحانی)بمطابق 26 مئی 1564ء کو نصف شب کے بعد سرہند شریف ہندوستان میں ہوئی۔[2] آپ کے والد شیخ عبد الاحد ایک ممتاز عالم دین تھے اور صوفی تھے۔ صغر سنی میں ہی قرآن حفظ کر کے اپنے والد سے علوم متداولہ حاصل کیے پھر سیالکوٹ جا کر مولانا کمال الدیّن کشمیری سے معقولات کی تکمیل کی اور اکابر محدثّین سے فن حدیث حاصل کیا. آپ سترہ سال کی عمر میں تمام مراحل تعلیم سے فارغ ہو کر درس و تدریس میں مشغول ہو گئے۔ تصوف میں سلسلہ چشتیہ کی تعلیم اپنے والد سے پائی، سلسلہ قادریہ کی اور سلسلہ نقشبندیہ کی تعلیم دہلی جاکر خواجہ باقی باللہ سے حاصل کی۔ 1599ء میں آپ نے خواجہ باقی باللہ کے ہاتھ پر بیعت کی۔ آپ کے علم و بزرگی کی شہرت اس قدر پھیلی کہ روم، شام، ماوراء النہر اور افغانستان وغیرہ تمام عالم اسلام کے مشائخ علما اور ارادتمند آکر آپ سے مستفید و کے خطاب سے یاد کیے جانے لگے۔ یہ خطاب سب سے پہلے ''مجدد الف ثانی ''مستفیض ہوتے۔ یہاں تک کہ وہ نے استعمال کیا. طریقت کے ساتھ وہ شریعت کے بھی سخت پابند تھے۔ آپ کو ''عبدالحکیم سیالکوٹی''آپ کے لیے مرشد کی وفات (نومبر 1603ء) کے بعد سلسلہ نقشبندیہ کی سربراہی کا شرف حاصل ہوا اور آخری عمر تک دعوت وارشاد سے متعلق رہے سرہند میں بروز سہ شنبہ 28 صفرالمظفر 1034ھ بعمر 62 سال اور کچھ ماہ وفات [3]پائی اور وہیں مدفون ہوئے۔

مجدد کا لقب

بعض روایات سے یہ ثابت ہوتا ہے کہ ہر ہزار سال کے بعد تجدید دین کے لیے اللہ تعالیٰ ایک مجددمبعوث فرماتا ہے۔ چنانچہ علما کا اتفاق ہے کہ عمر بن عبدالعزیز رحمۃ اللہ تعالیٰ علیہ کے بعد دوسرے ہزار سال کے مجدد آپ ہی ہیں اسی لیے آپ کو مجدد الف ثانی کہتے ہیں۔

دیگر القابات
بارگاہ فلک رفعت، آرام گاہ عالی مرتبت، دربار گوہر بار، مزار، اعلیٰ عظیم البرکت، قیوم ملت، خزینۃ الرحمۃ، محدث رحمانی، غوث صمدانی، امام ربانی، المجدد المنور الف ثانی، ابو البرکات شیخ بد ر الدین احمد فاروقی، نقشبندی، سرہندی۔[4]

شریعت کی پابندی
مجدد الف ثانی مطلقاً تصوف کے مخالف نہیں تھے۔ آپ نے ایسے تصوف کی مخالفت کی جو شریعت کے تابع نہ ہو۔ قرآن و سنت کی پیروی اور ارکان اسلام پر عمل ہی آپ کے نزدیک کامیابی کا واحد راستہ ہے۔ آپ کے مرشد خواجہ رضی الدین محمد باقی با اللہ رحمۃ اللہ علیہ نے ہندوستان میں تصوف کا نقشبندی سلسلہ متعارف کرایا اور آپ نے اس سلسلہ کو ترقی دی۔

بدعات کا رد
مغل بادشاہ جلال الدین اکبر کے دور میں بہت سی ہندوانہ رسوم و رواج اور عقائد اسلام میں شامل ہو گئے تھے۔ اسلام کا تشخص ختم ہو چکا تھا اور اسلام اور ہندومت میں فرق کرنا مشکل ہو گیا تھا۔ ان کے مطابق دین میں ہر نئی بات بدعت ہے اور بدعت گمراہی ہے۔ آپ اپنے ایک مکتوب میں بدعات کی شدید مخالفت کرتے ہوئے لکھتے ہیں کہ:

" لوگوں نے کہا ہے کہ بدعت کی دو قسمیں ہیں: بدعت حسنہ اور بدعت سیئہ۔ بدعت دافع سنت ہے، اس فقیر کو ان بدعات میں سے کسی بدعت میں حسن و نورانیت نظر نہیں آتی اور سوائے ظلمت اور کدورت کے کچھ محسوس نہیں ہوتا۔ "

اہل تشیع کا رد
ردِ روافض برصغیر میں اہل تشیع کے خلاف لکھی جانے والی پہلی کتاب ہے۔ اس میں شیخ احمد سرہندی لکھتے ہیں:

" علمائے ماوراء النہر نے فرمایا کہ جب شیعہ حضرات شیخین، ذی النورین اور ازدواج مطہرات کو گالی دیتے ہیں اور ان پر لعنت بھیجتے ہیں تو بروئے شرع کافر ہوئے۔ لہٰذا بادشاہِ اسلام اور نیز عام لوگوں پر بحکم خداوندی اور اعلائے کلمۃ الحق کی خاطر واجب و لازم ہے کہ ان کو قتل کریں، ان کا قلع قمع کریں، ان کے مکانات کو برباد و ویران کریں اور ان کے مال و اسباب کو چھین لیں۔ یہ سب مسلمانوں کیلئے جائز و روا ہے"[5]۔

البتہ چونکہ شیخ احمد سرہندی کا اس وقت معاشرے پر اتنا اثر نہ تھا، مغل دور کا ہندوستان صلح کل پر کاربند رہا۔ آپ کے خیالات آپ کی وفات کے سو سال بعد شاہ ولی اللہ اور انکے خاندان نے زیادہ مقبول بنائے۔شاہ ولی اللہ نے شیخ احمد سرہندی کی کتاب "رد روافض" کا عربی میں ترجمہ بعنوان"المقدمۃ السنیہ فی الانتصار للفرقۃ السنیہ"کیا[6]۔ اس خیال کو عملی جامہ پہنانے کا سلسلہ 1820ء میں شروع ہوا جب سید احمد بریلوی نے اپنے مجاہدین کو امام بارگاہوں پر حملے کے لیے ابھارا۔ پروفیسر باربرا مٹکاف لکھتی ہیں:

" دوسری قسم کے امور جن سے سید احمد بریلوی شدید پرخاش رکھتے تھے ، وہ تھے جو تشیع سے پھوٹتے تھے۔ انہوں نے مسلمانوں کو تعزیے بنانے سے خاص طور پر منع کیا، جو شہدائے کربلا کے مزارات کی شبیہ تھے جن کو محرم کے جلوسوں میں اٹھایا جاتا تھا۔ شاہ اسماعیل دہلوی نے لکھا:

'ایک سچے مومن کو طاقت کے استعمال کے ذریعے تعزیہ توڑنے کے عمل کو بت توڑنے کے برابر سمجھنا چاہئیے۔اگر وہ خود نہ توڑ سکے تو اسے چاہئیے کہ وہ دوسروں کو ایسا کرنے کی تلقین کرے۔ اگر یہ بھی اس کے بس میں نہ ہو تو اسے کم از کم دل میں تعزیے سے نفرت کرنی چاہئیے۔'

سید احمد بریلوی کے سوانح نگاروں نے ، بلا شبہ تعداد کے معاملے میں مبالغہ آرائی کرتے ہوئے، سید احمد بریلوی کے ہاتھوں ہزاروں کی تعداد میں تعزیے توڑنے اور امام بارگاہوں کے جلائے جانے کاذکر کیا ہے"[7].

قید و بند کی صعوبت

مجدد الف ثانی کو اپنے مشن کی تکمیل کے لیے دور ابتلا سے بھی گزرنا پڑا۔ بعض امرا نے مغل بادشاہ جہانگیر کو آپ کے خلاف بھڑکایا اور یقین دلایا کہ آپ باغی ہیں اور اس کی نشانی یہ بتائی کہ آپ بادشاہ کو تعظیمی سجدہ کرنے کے قائل نہیں ہیں، چنانچہ آپ کو دربار میں طلب کیا جائے۔ جہانگیر نے مجدد الف ثانی کو دربار میں طلب کر لیا۔ آپ نے بادشاہ کو تعظیمی سجدہ نہ کیا۔ جب بادشاہ نے وجہ پوچھی تو آپ نے کہا:

" سجدہ اللہ کے علاوہ کسی اور کے لیے جائز نہیں ہے۔ یہ اللہ کا حق ہے جو اس کے کسی بندے کو نہیں دیا جا سکتا۔ "

بادشاہ نے ہر ممکن کوشش کی کہ شیخ جھک جائیں لیکن مجدد الف ثانی اپنے موقف پر ڈٹے رہے۔ بعض امرا نے بادشاہ کو آپ کے قتل کا مشورہ دیا۔ غیر معمولی اثر و رسوخ کی وجہ سے یہ تو نہ ہو سکا البتہ آپ کو گوالیار کے قلعے میں نظر بند کر دیا گیا۔ آپ نے قلعے کے اندر ہی تبلیغ شروع کر دی اور وہاں کئی غیر مسلم مسلمان ہو گئے۔ قلعہ میں متعین فوج میں بھی آپ کو کافی اثر و رسوخ حاصل ہو گیا۔ بالآخر جہانگیر کو اپنی غلطی کا احساس ہوا اور آپ کو رہا کر دیا۔ رہائی کے بعد جہانگیر نے آپ کو اپنے لشکر کے ساتھ ہی رکھا۔

شاہ ولی اللہ

شاہ ولی اللہ (پیدائش: 1703ء، انتقال:1762ء) برصغیر پاک و ہند میں عہد مغلیہ کے مشہور عالم دین، محدث اور مصنف تھے۔ مجدد الف ثانی اور ان کے ساتھیوں نے اصلاح کا جو کام شروع کیا تھا شاہ ولی اللہ نے اس کام کی رفتار اور تیز کردی۔ ان دونوں میں بس یہ فرق تھا کہ مجدد الف ثانی چونکہ مسلمانوں کے عہد عروج میں ہوئے تھے اس لیے ان کی توجہ زیادہ تر ان خرابیوں کی طرف رہی جو مسلمانوں میں غیر مسلموں کے میل جول کی وجہ سے پھیل گئیں تھیں لیکن شاہ ولی اللہ چونکہ ایک ایسے زمانے سے تعلق رکھتے تھے جب مسلمانوں کا زوال شروع ہو گیا تھا اس لیے انہوں نے مسلمانوں کے زوال کے اسباب پر بھی غور کیا اور اس کے علاج کے بھی طریقے بتائے۔

ابتدائی زندگی

شاہ ولی اللہ مجدد الف ثانی کے انتقال کے تقریباً 80 سال بعد دہلی میں پیدا ہوئے۔ 7 سال کی عمر میں قرآن حفظ کیا وہ ابھی چار سال کے تھے کہ شہنشاہ اورنگزیب عالمگیر کا انتقال ہو گیا۔ اس کے چند سال بعد مغلوں کی عظیم الشان سلطنت ٹکڑے ٹکڑے ہونا شروع ہو گئی۔ سارے ملک میں بے امنی پھیل گئی اور مرہٹے ملک کے بہت بڑے حصے پر قابض ہونے کے بعد دہلی پر قبضہ کرنے کا خواب دیکھنے لگے۔

مسلمانوں کی نہ صرف سیاسی حالت خراب تھی بلکہ وہ اخلاقی حیثیت سے بھی زوال کی طرف جا رہے تھے۔ آرام طلبی، عیش و عشرت، دولت سے محبت، خود غرضی، بے ایمانی اور اسی قسم کی دوسری خرابیاں ان میں عام ہو گئی تھیں۔ شاہ ولی اللہ نے اپنی تصنیف و تالیف اور اصلاح کا کام اسی نازک زمانے میں شروع کیا۔ ان کی کوشش تھی کہ ایک طرف مسلمانوں میں اتحاد پیدا ہو اور وہ پھر سے ایک مضبوط سلطنت قائم کریں اور دوسری طرف اپنی اخلاقی خرابیوں کو دور کرکے اور غیر اسلامی طریقوں و رسوم و رواج کو چھوڑ کو دورِ اول کے مسلمانوں جیسی زندگی اختیار کر لیں۔

اصلاح کا کام

انہوں نے مسلمانوں کو سیاسی حیثیت سے مضبوط بنانے کے لیے بادشاہوں اور امرا سے خط کتابت بھی کی۔ چنانچہ احمد شاہ ابدالی نے اپنا مشہور حملہ شاہ ولی اللہ کے خط پر ہی کیا جس میں اس نے پانی پت کی تیسری لڑائی میں مرہٹوں کو شکست دی تھی۔

شاہ ولی اللہ نے سماجی اصلاح کا بھی کام کیا۔ مسلمانوں میں ہندوؤں کے اثر کی وجہ سے بیوہ عورتوں کی شادی بری سمجھی جانے لگی تھی۔ شاہ ولی اللہ نے اس رسم کی مخالفت کی اسی طرح انہوں نے بڑے بڑے مہر باندھنے اور خوشی و غم کے موقع پر فضول خرچی سے روکا۔ حضرت شاہ ولی اللہ امت کے کلیدی مسائل کو مستقبل کی نظر سے بھی دیکھتے تھے۔

انہوں نے مسلمانوں کے مختلف فرقوں کے اختلافات کو ختم کرنے کی کوشش کی اور اس پر زور دیا کہ اختلاف کی صورت میں انتہا پسندی کی جگہ اعتدال سے کام لیا جائے۔

انہوں نے تصوف کی بھی اصلاح کی اور پیری مریدی کے طریقوں کو غلط راستے سے ہٹایا۔

کارنامے

شاہ ولی اللہ کا ایک بڑا کارنامہ قرآن مجید کا فارسی ترجمہ ہے۔ پاکستان و ہندوستان میں مسلمانوں کی علمی زبان فارسی تھی۔ قرآن چونکہ عربی میں ہے اس لیے بہت کم لوگ اس کو سمجھ سکتے تھے۔ شاہ ولی اللہ نے قرآن مجید کا فارسی ترجمہ کرکے اس رکاوٹ کو دور کر دیا۔ اس طرح زیادہ سے زیادہ لوگ اسلام کی تعلیم سے واقف ہونے لگے۔

شاہ ولی اللہ ترجمۂ قرآن کے علاوہ اور بہت ساری کتابوں کے مصنف ہیں۔ یہ کتابیں علم تفسیر، حدیث،فقہ، تاریخ اور تصوف پر ہیں۔ ان عالمانہ کتابوں کی وجہ سے وہ امام غزالی، ابن حزم اور ابن تیمیہ کی طرح تاریخ اسلام کے سب سے بڑے عالموں اور مصنفوں میں شمار ہوتے ہیں۔

ان کی سب سے مشہور کتاب "حجۃ اللہ البالغہ" ہے۔ امام غزالی کی "احیاء العلوم" کی طرح یہ کتاب بھی دنیا کی ان چند کتابوں میں سے ہے جو ہمیشہ قدر کی نگاہ سے دیکھی جائیں گی۔ اس کتاب میں شاہ ولی اللہ نے اسلامی عقائد اور اسلامی تعلیمات کی وضاحت کی ہے اور دلیلیں دے کر اسلامی احکام اور عقاغد کی صداقت ثابت کی ہے۔ اصل کتاب عربی میں ہے لیکن اس کا اردو میں بھی ترجمہ ہو گیا ہے۔

شاہ ولی اللہ دہلوی رحمت اللہ علیہ نے اسلامی ریاست اور اس کے نظام کے بارے میں ایک انتہائی قیمتی اور منفرد کتاب ازالۃالخفاء عن خلافۃ الخلفاء فارسی زبان میں تالیف کی تھی، یہ کتاب دوہزار سے زائد صفحات پر مشتمل ہے اور انتہائی پرمغز ابحاث پر مشتمل ہے۔اس کتاب کا اردو ترجمہ مولانا عبدالشکور فاروقی مجددی نے کیا ہے جو قدیمی کتب خانہ آرام باغ کراچی سے شائع ہوا ہے۔ مولانا محمد بشیر سیالکوٹی مدیر دارالعلم اسلام آباد نے 2013

میں اس کتاب کا عربی زبان میں ترجمہ مکمل کر دیا۔ جو مئی 2016ء میں دو ضخیم جلدوں دارالعلم آبپارہ مارکیٹ اسلام آباد سے شائع ہوا۔

شاہ ولی اللہ اپنی کوششوں کی وجہ سے غزالی، ابن تیمیہ اور مجدد الف ثانی کی طرح اپنی صدی کے مجدد سمجھے جاتے ہیں۔ حقیقت یہ ہے کہ ہندوستان میں مسلمانوں کے زوال کے بعد جو بیداری پیدا ہوئی اور اس وقت خطے میں اسلامی جو احیائی تحاریک موجودہ ہیں ان کے بانی شاہ ولی اللہ ہی ہیں۔ شاہ ولی اللہ جہاں خود ایک بہت بڑے عالم، مصلح اور رہنما تھے۔ وہاں وہ اس لحاظ سے بھی بڑے خوش قسمت ہیں کہ ان کی اولاد میں ایسے ایسے عالم پیدا ہوئے جنھوں نے ہند وپاک کے مسلمانوں کی زندگی میں انقلاب برپا کر دیا۔

سوال نمبر 2:

جواب:

27 مارچ 1898ء) المعروف سر سید انیسویں صدی کا ایک –سید احمد بن متقی خان (17 اکتوبر 1817ء ہندوستانی مسلم نظریۂ عملیت کا حامل [2]، مصلح [3][4] اور فلسفی تھے۔ آپ کو برصغیر میں مسلم قوم پرستی کا سرخیل مانا جاتا ہے اور دو قومی نظریہ کا خالق تصور کیا جاتا ہے جو کے آگے چل کر تحریک پاکستان کی بنیاد [6][بنی۔[5

ء میں اس نے ایسٹ انڈیا کمپنی میں ملازمت اختیار کی اور 1867ء وہ چھوٹے مقدمات کے لیے جج مقرر 1838 کیے گئے۔ 1876ء میں وہ ملازمت سے مستعفی ہوئے۔ 1857ء کی جنگ آزادی کے دوران میں وہ ایسٹ انڈیا کمپنی کا وفادار رہے اور یورپیوں کی جانیں بچانے میں اس کے کردار کی سلطنت برطانیہ کی طرف سے ستائش کی گئی۔[3] بغاوت ختم ہونے کے بعد انہوں نے اسباب بغاوت ہند پر ایک رسالہ لکھا جس میں ہندوستان کی رعایا کو اور خاص کر مسلمانوں کو بغاوت کے الزام سے بری کیا۔ اس رسالہ کا فائدہ سلطنت برطانیہ کو ہوا جس نے اس کی بنیاد پر ایسٹ انڈیا کمپنی سے برصغیر کا تمام قبضہ لے لیا اور ہندوستان کے تمام معاملات براہ راست اپنے قبضہ میں لے لیے۔ مسلمانوں کے راسخ الاعتقاد طرز کو ان کے مستقبل کے لیے خطرہ سمجھتے ہوئے سرسید نے مغربی طرز کی سائنسی تعلیم کو فروغ دینے کے لیے جدید اسکولوں اور جرائد کا اجرا کیا اپنے کلامی مکتبِ فکر کی بنیاد ڈالی جو معتزلہ کے افکار کا چربہ تھا مگر اس کے کلامی نظریات مقبول نہ ہو سکے اس لیے صرف سائنسی علوم کی اشاعت تک محدود رہا۔

ء میں سر سید نے مرادآباد میں گلشن اسکول، 1863ء میں غازی پور میں وکٹوریہ اسکول اور 1864ء میں 1859 سائنسی سوسائٹی برائے مسلمانان قائم کی۔ 1875ء میں محمدن اینگلو اورینٹل کالج جو جنوبی ایشیا میں پہلی مسلم یونیورسٹی بنا۔[7] اپنے کردار کے دوران میں سر سید نے بار بار مسلمانوں کو سلطنت برطانیہ سے وفاداری پر زور دیا اور تمام ہندوستانی مسلمانوں کو اردو کو بطور زبانِ رابطۂ عامہ اپنانے کی کوشش کی۔۔ وہ اپنی برطانوی [8]وفاداریوں کے سبب انڈین نیشنل کانگریس کی طرف سے گہری تنقید کا نشانہ بنا۔

سر سید کو پاکستان اور بھارتی مسلمانوں میں ایک موثر شخصیت کے طور پر دیکھا جاتا ہے اور اکثر دو قومی نظریہ کا بانی تصور کیا جاتا ہے۔ کچھ لوگ اس سے اختلاف کرتے ہیں اور تاریخی بددیانتی کرتے ہوئے دوقومی نظریے کو سترہویں صدی کے غیر اہم کردار حضرت مجدد الف ثانی کے سرمنڈھ دیتے ہیں۔ جس کا کوئی ٹھوس علمی ثبوت موجود نہیں ہے بلکہ اثر اور متاثر کی اتنی نسبت ہے جتنی کہ سکندراعظم اور نپولین میں موجود ہوسکتی ہے۔ سر سید کی اسلام کو سائنس اور جدیدیت کے ساتھ ہم آہنگ بنانے کے لیے عقلیت پسند (معتزلہ)

روایت کی وکالت نے عالمی طور پر اسلامی اصلاح پسندی کو متاثر کیا اور ناقابل تلافی نقصان دیا۔[9] پاکستان میں کئی سرکاری عمارتوں اور جامعات اور تدریسی اداروں کے نام سر سید کے نام پر ہیں۔

تعلیمی خدمات == سرسید کا نقطۂ نظر تھا کہ مسلم قوم کی ترقی کی راہ تعلیم کی مدد سے ہی ہموار کی جا ==' سکتی ہے۔ انہوں نے مسلمانوں کو مشورہ دیا کہ وہ جدید تعلیم حاصل کریں اوار دوسری اقوام کے شانہ بشانہ آگے بڑھیں۔ انہوں نے محض مشورہ ہی نہیں دیا بلکہ مسلمانوں کے لیے جدید علوم کے حصول کی سہولتیں بھی فراہم کرنے کی پوری کوشش کی۔ انہوں نے سائنس، جدید ادب اور معاشرتی علوم کی طرف مسلمانوں کو راغب کیا۔ انہوں نے انگریزی کی تعلیم کو مسلمانوں کی کامیابی کے لیے زینہ قرار دیا تاکہ وہ ہندوئوں کے مساوی و معاشرتی درجہ حاصل کر سکیں۔

1859 ء میں سرسید نے مراد آباد اور 1862ء میں غازی پور میں مدرسے قائم کیے۔ ان مدرسو ں میں فارسی کے علاوہ انگریزی زبان اور جدید علوم پڑھانے کا بندوبست بھی کیا گیا۔

1875 ء میں انہوں نے علی گڑھ میں ایم اے او ہائی اسکول کی بنیاد رکھی جو بعد ازاں ایم۔ اے۔ او کالج اور آپ کی وفات کے بعد 1920ء میں یونیورسٹی کا درجہ اختیار کر گیا۔ ان اداروں میں انہوں نے آرچ بولڈ آرنلڈ اور موریسن جیسے انگریز اساتذہ کی خدمات حاصل کیں۔

1863 ء میں غازی پور میں سر سید نے سائنٹفک سوسائٹی کے نام سے ایک ادارہ قائم کیا۔ اس ادارے کے قیام کا مقصد مغربی زبانوں میں لکھی گئیں کتب کے اردو تراجم کرانا تھا۔ بعد ازاں 1876ء میں سوسائٹی کے دفاتر علی گڑھ میں منتقل کر دیے گئے۔ سر سید نے نئی نسل کو انگریزی زبان سیکھنے کی ترغیب دی تاکہ وہ جدید مغربی علوم سے بہرہ ور ہو سکے۔ یوں دیکھتے ہی دیکھتے مغربی ادب سائنس اور دیگر علوم کا بہت سا سرمایہ اردو زبان میں منتقل ہو گیا۔ سوسائٹی کی خدمات کی بدولت اردو زبان کو بہت ترقی نصیب ہوئی ۔

1886 ء میں سر سید احمد خاں نے محمڈن ایجوکیشنل کانفرنس کے نام سے ایک ادارے کی بنیاد رکھی گئی۔ مسلم قوم کی تعلیمی ضرورتوں کے لیے افراد کی فراہمی میں اس ادارے نے بڑی مدد دی اور کانفرنس کی کارکردگی سے متاثر ہو کر مختلف شخصیات نے اپنے اپنے علاقوں میں تعلیمی سرگرمیوں کا آغاز کیا۔ لاہور میں اسلامیہ کالج کراچی میں سندھ مدرسۃ الاسلام، پشاور میں اسلامیہ کالج اور کانپور میں حلیم کالج کی بنیاد رکھی۔ محمڈن ایجوکیشنل کانفرنس مسلمانوں کے سیاسی ثقافتی معاشی اور معاشرت حقوق کے تحفظ کے لیے بھی کوشاں رہی۔[17]

مسلمانوں کی بھلائی کی فکر
بمقام بنارس "کمیٹی خواستگار ترقی تعلیم مسلمانان ہندوستان" منعقد ہو گئی جس کے سیکرٹری سر سید قرار پائے۔ اس کمیٹی کا کام یہ تھا کہ وہ جہاں تک ہو سکے اس بات کے دریافت کرنے میں کوشش کرے کہ سرکاری کالجوں اور اسکولوں میں مسلمان طالبِ علم کس لیے کم پڑھتے ہیں، علومِ قدیمہ ان میں کیوں گھٹ گئے اور علومِ جدیدہ ان میں کیوں نہیں رواج پاتے اور جب یہ موانع ٹھیک ٹھیک دریافت ہو جائیں تو ان کے رفع کرنے کی تدبیریں دریافت کرے اور ان تدبیروں پر عمل درآمد کرنے میں کوشش کرے۔

نواب محسن الملک کا بیان ہے کہ، "جس تاریخ کو کمیٹی مذ کور کے انعقاد کے لیے جلسہ قرار پایا تھا اس سے ایک روز پہلے میں بنارس میں پہنچ گیا تھا۔ رات کو سر سید نے میرا پلنگ بھی اپنے ہی کمرے میں بچھوایا تھا۔ گیارہ بجے تک مسلمانوں کی تعلیم کے متعلق باتیں ہوتی رہیں، اس کے بعد میری آنکھ لگ گئی۔ دو بجے کے قریب میری آنکھ کھلی تو میں نے سر سید کو ان کے پلنگ پر نہ پایا۔ میں اُن کے دیکھنے کو کمرے سے باہر نکلا،

دیکھتا کیا ہوں کہ برآمدے میں ٹہل رہے ہیں اور زار و قطار روتے جاتے ہیں، میں نے گھبرا کر پُوچھا کہ کیا خدانخواستہ کہیں سے کوئی افسوسناک خبر آئی ہے؟ یہ سن کر اور زیادہ رونے لگے اور کہا کہ: "اس سے زیادہ اور کیا مُصیبت ہو سکتی ہے کہ مسلمان بگڑ گئے اور بگڑتے جاتے ہیں اور کوئی صورت ان کی بھلائی کی نظر نہیں آتی۔"

پھر آپ ہی کہنے لگے کہ: "جو جلسہ کل ہونے والا ہے، مجھے امید نہیں کہ اس سے کوئی عمدہ نتیجہ پیدا ہو۔ ساری رات اُدھیڑ بن میں گزر گئی ہے کہ دیکھیے، کل کے جلسے کا انجام کیا ہوتا ہے اور کسی کے کان پر جُوں چلتی ہے یا نہیں۔"

نواب محسن الملک کہتے ہیں کہ سر سید کی یہ حالت دیکھ کر جو کیفیت میرے دل پر گزری اس کو بیان نہیں کر سکتا اور جو عظمت اس شخص کی اس دن سے میرے دل میں بیٹھی ہوئی ہے اس کو میں ہی خوب جانتا ہوں۔" [18]

مدرسہ کے لیے دوروں کے اخراجات
مدرسہ کے لیے انہوں نے بڑے بڑے لمبے سفر کیے۔۔ بڑا رہا روپیہ ان سفروں میں ان کا صرف ہوا۔ اگرچہ ان کے دوست اور رفیق بھی، جو ان کے ہمراہ جاتے تھے، اپنا اپنا خرچ اپنی گرہ سے اُٹھاتے تھے لیکن وہ اکثر بدلتے رہتے تھے اور سر سید کا ہر سفر میں ہونا ضروری تھا۔ اس کے سوا ہمیشہ ریزروڈ گاڑیوں میں سفر ہوتا تھا اور جس قدر سواریاں کم ہوتی تھیں اُن کی کمی زیادہ تر سر سید کو پوری کرنی پڑتی تھی۔ ایک بار اُن کے ایک دوست نے کہا، "روپیہ نہیں ہے۔" اُن کے منہ سے "نکلا کہ جب آپ کالج کے واسطے سفر کرتے ہیں تو آپ کا سفرِ خرچ کمیٹی کو دینا چاہیے۔" سر سید نے کہا:

میں اس بات کو ہرگز گوارا نہیں کر سکتا۔ مدرسہ چلے یا نہ چلے مگر میں اسی حالت میں مدرسہ کے لیے سفر کر سکتا ہوں جب سفر کے کل اخراجات اپنے پاس سے اُٹھا سکوں۔" [18]

کالج کا قیام، قومی احساسات کی ترجمانی
1874ء میں جبکہ سر سید پہلی بار چندہ کے لیے لاہور گئے ہیں اس وقت انہوں نے راقم کے سامنے بابو نوین چندر سے ایک سوال کے جواب میں یہ کہا تھا کہ:

"صرف اس خیال سے کہ یہ کالج خاص مسلمانوں کے لیے ان ہی کے رُوپے سے قائم کیا جاتا ہے، ایک تو مسلمانوں میں اور دوسری طرف ان کی ریس سے ہندوؤں میں توقع سے زیادہ جوش پیدا ہو گیا ہے۔"

اور پھر خان بہادر برکت علی خاں سے پُوچھا کہ: "کیوں حضرت اگر یہ قومی کالج نہ ہوتا تو آپ ہماری مدارات اسی جوشِ محبت کے ساتھ کرتے؟" انہوں نے صاف کہہ دیا کہ، "ہرگز نہیں۔"

[18]اس سے صاف ظاہر ہے کہ سر سید اپنے کام کے شروع ہی میں اس قومی فیلنگ سے بخوبی واقف تھے۔

کالج فاؤنڈرز ڈے کی بجائے فاؤنڈیشن ڈے
ایک دفعہ کالج کے بعض یورپین پروفیسروں نے یہ تحریک کی کہ یہاں بھی ولایت کے کالجوں کی طرح فاؤنڈرز ڈے (یعنی بانی مدرسہ کی سالگرہ کا دن) بطور ایک خوشی کے دن کے قرار دیا جائے جس میں ہر سال کالج کے ہوا خواہ اور دوست اور طالبعلم جمع ہو کر ایک جگہ کھانا کھایا کریں اور کچھ تماشے تفریح کے طور پر کیے جایا کریں۔ سر سید نے اس کو بھی منظور نہیں کیا اور یہ کہا کہ: "ہمارے ملک کی حالت انگلستان کی حالت سے بالکل

جداگانہ ہے۔ وہاں ایک ایک شخص لاکھوں کروڑوں روپیہ اپنے پاس سے دے کر کالج قائم کر دیتا ہے اور یہاں سِوا اس کے کہ ہزاروں لاکھوں آدمیوں سے کہ چندہ جمع کر کے کالج قائم کیا جائے اور کوئی صُورت ممکن نہیں۔ پس کوئی وجہ نہیں کہ جو کالج قوم کے روپیہ سے قائم ہو اُس کے کسی خاص بانی کے نام پر ایسی رسم ادا کی جائے، چنانچہ "اس لیے میرے نزدیک بجائے فاؤنڈرز ڈے کے فاؤنڈیشن ڈے (کالج کی سالگرہ کا دن) مقرر ہونا چاہیے۔ [18]اسی تجویز کے موافق کئی سال تک یہ رسم ادا کی گئی۔

مدرسہ کے علاوہ دیگر رفاہی کاموں میں کوشش کرنے سے انکار
سر سید نے مدرسہ کی خاطر اس بات کو بھی اپنے اُوپر لازم کر لیا تھا کہ کوئی سعی اور کوشش کسی ایسے کام میں صرف نہ کی جائے جو مدرسۃ العلوم سے کچھ علاقہ نہ رکھتا ہو۔۔۔ سر سید کے ایک معزز ہم وطن نے ایک رفاہِ عام کے کام میں ان کو شریک کرنا اور اپنی کمیٹی کا رکن بنانا چاہا۔ انہوں نے صاف کہہ دیا کہ: "میں صلاح و مشورے سے مدد دینے کو آمادہ ہوں لیکن چندہ نہ خود دوں گا اور نہ اوروں سے دلوانے میں کوشش کروں گا، اگر [18] "اس شرط پر ممبر بنانا ہو تو مجھ کو ممبری سے کچھ انکار نہیں۔

قومی بھلائی کے لیے لاٹری کا جواز
صیغہ تعمیرات کے سوا کالج کے اور اخراجات کے لیے سر سید نے نئے نئے طریقوں سے رُوپیہ وصُول کیا جس کو سن کر لوگ تعجب کریں گے۔ ایک دفع تیس ہزار کی لاٹری ڈالی۔ ہر چند مسلمانوں کی طرف سے سخت مخالفت ہوئی، مگر سر سید نے کچھ پروا نہ کی اور بعد تقسیم انعامات کے بیس ہزار کے قریب بچ رہا۔

لطیفہ: جن دنوں میں لاٹری کی تجویز درپیش تھی، دو رئیس سر سید کے پاس آئے اور لاٹری کے ناجائز ہونے کی گفتگو شروع کی۔ سر سید نے کہا: "جہاں ہم اپنی ذات کے لیے ہزاروں ناجائز کام کرتے ہیں وہاں قوم کی بھلائی کے لیے بھی ایک ناجائز کام سہی۔

سیاسی خدمات
آپ نے مسلمانوں کو مشورہ دیا کہ سیاست سے دور رہتے ہوئے اپنی تمام تر توجہ تعلیم کے حصول اورمعاشی و معاشرتی طورپر بحای پر دین تاکہ وہ ہندوؤں کے برابر مقام حاصل کر سکیں۔ سرسید ہندو مسلم اختلافات کو ختم کر کے تعاون اور اتحاد کی راہ رپ گامزن کرنے کے حق میں بھی تھے۔ انہوں نے دونوں قوموں کو ایک دوسرے کے قریب لانے کی مسلسل کوششیں کیں۔ اپنے تعلیمی اداروں میں ہندو اساتذہ بھرتی کیے اور ہندو طلبہ کو داخلے دیے ہندووں نے اردو کے مقابل ہندی کو سرکاری دفاتر کی زبان کا درجہ دلوانے کے لیے کوششیں شروع کر دیں۔ 1857ء میں اردو ہندی تنازعے نے سرسید کو بد دِل کر دیا اور انہوں نے صرف اور صرف مسلمانوں کے حقوق کے تحفظ کے لیے اپنی تحریک کے ذریعے کام شروع کر دیا۔ زبان کا تنازع سرسید کی سوچ اور عمل کو بدل گیا۔ [27]انہوں نے دو قومی نظریہ کی بنیادپر برصغیر کے سیاسی اور دیگر مسائل کے حل تلاش کرنے کا فیصلہ کیا۔

سرسید کی سیاسی حکمت عملی کی بنیاد دو قومی نظریہ تھا۔ سرسید نے مسلمانوں کو ایک علاحدہ قوم ثابت کیا اور حضرت مجدد الف ثانی اور شاہ ولی اللہ کے افکار کو آگے بڑھایا۔ دو قومی نظریہ کی اصطلاح سرسید نے ہی سب سے پہلے استعمال کی۔ انہوں نے کہا کہ مسلمان جداگانہ ثقافت رسم و رواج اور مذہب کے حامل ہیں اور ہر اعتبار سے ایک مکمل قوم کا درجہ رکھتے ہیں۔ مسلمانوں کی علاحدہ قومی حیثیت کے حوالے سے سرسید احمد نے ان کے لیے لوکل کونسلوں میں نشستوں کی تخصیص چاہی اعلیٰ سرکاری ملازمتوں کے لیے کھلے مقابلے کے امتحان کے خلاف مہم چلائی، اکثریت کی مرضی کے تحت قائم ہونے والی حکومت والے نظام کو ناپسند کیا۔ ا نہو ں نے مسلمانوں کی علاحدہ پہچان کروائی اور دو قومی نظریہ کی بنیاد پر ان کے لیے تحفظات مانگے۔ سر سید مسلمانوں کوسیاست سے دور رکھنا چاہتے تھے۔ اسی لیے انہوں نے مسلمانوں کو 1885ء میں ایک انگریز اے او ہیوم کی کوششوں سے قائم ہونے والی آل انڈیا کانگریس سے دوررکھا۔ بعد میں ہونے والے واقعات نے سرسید کی پالیسی

کی افادیت کو ثابت کر دیا ان کو بجا طور پر پاکستان کے بانیوں میں شمار کیا جاتاہے۔ مولوی عبدالحق نے سرسید [29][کی قومی و سیاسی خدمات کے حوالے سے لکھا ہے:[28

[30],,قصر پاکستان کی بنیاد میں پہلی اینٹ اسی مرد پیر نے رکھی تھی،،۔

روایتی تعلیم پرتنقید

غالب کے روکھے پن کا ہم پچھلے صفحات میں ذکر کر چکے ہیں۔ جب سر سید نے ان سے آئین اکبری کے لیے تقریظ لکھنے کی درخواست کی تو غالب نے اس کا جواب ایک سخت فارسی نظم کی صورت میں دیا، جس کا لب لباب یہ تھا کہ اپنا وقت اکبر کے آئین پر ضائع نہ کرو اور یہ کہ اب کا زمانہ جدیدیت کا ہے اور آئین تو اب کلکتے میں بنتا ہے۔ غالب نے لکھا کہ اصل کمال تو ان لوگوں کا ہے جنہوں نے سائنسی طریقہ کار کو اپنایا ہے اور جو ایسے دخانی جہازوں میں سفرکرتے ہیں جن پر ہوا کے چلنے، نہ چلنے سے کوئی فرق نہیں پڑتا۔ غالب نے سر سید کو نصیحت کی کہ وہ ماضی پرستی ترک کر کے مستقبل کا سوچیں۔ اگرچہ وقتی طورپر سر سید کو غالب کی یہ باتیں ضرور کھٹکی ہوں گی مگر ان کی اپنی سوچ بھی ترقی پسندی کی طرف مائل ہو رہی تھی۔ انہوں نے اس واقعے کے بعد آئینِ اکبری کا ذکر تک کرنا چھوڑ دیا۔

چالیس یا پینتالیس برس کی عمر تک پہنچتے پہنچتے سر سید پربھی یہ واضح ہو چکا تھا کہ جو جادو کی چھڑی انگریز نے اپنے ہاتھ میں پکڑ رکھی ہے، اس کا نام جدید تعلیم اورسائنس ہے۔ یہ وہ طرزِ فکر ہے جو صرف عقل کی حاکمیت قبول کرتی ہے اور جس کے استدلال کی بنیادیں منقولاتی نہیں، تجرباتی ہیں۔ سر سید نے مشاہدہ کیا کہ مسلمان نوجوان اسے اپنانے سے گریزاں ہیں جبکہ ہندو اسے بخوشی اپنا رہے ہیں۔ سر سید کے ہم عصر اورشاعر :اکبر الٰہ آبادی کی یہ نظم بھی اس امر کی بخوبی نشاندہی کرتی ہے

معقولات پر اصرار

سر سید پر یہ اعتراض پوری قوت سے کیا جاتا ہے کہ وہ عقل و خرد کو فوقیت دینے کی طرف مائل ہیں، جب کہ اسلام کی اساس ایمان پر ہے۔ یہ ایک دلچسپ موضوع ہے۔ اسلامی تاریخ میں معقولات اور منقولات کا معرکہ بہت پرانا ہے۔ اس کاآغاز اسلام کی اولین صدی کے چند سال بعد ہی ہو گیا تھا۔ ان دو نظریات کا ٹکراؤ جبر اور قدر کے مسئلے سے شروع ہوا تھا۔ ایک طرف جبریے یہ کہتے تھے کہ انسان اپنی تقدیر کامالک ہر گز نہیں ہے اور وہ گویا قسمت کا بے اختیار غلام ہے جس کو ہوا کا جھونکا اِدھر یا اُدھر کہیں بھی لے جا سکتا ہے۔ دوسری طرف قدری یہ دعویٰ کرتے تھے کہ اللہ تعالیٰ نے انسان کو اپنی راہ بنانے کا کافی سامان مہیا کیا ہے اور یہ کہ انسانی تقدیر پتھر پر لکیر کی طرح غیر مبدل نہیں۔ آٹھویں صدی کے وسط میں ان دو فلسفوں کے پیروکاروں کے مابین زبردست اور خوں ریز تصادم ہوئے جس کے بعد بغداد میں واصل ابن عطا نے معتزلہ مکتبِ فکر قائم کیا۔ معتزلہ یہ دعوی کرتے تھے کہ اسلام کی بنیاد میں صرف ایمان ہی نہیں بلکہ منطق و مشاہدے کا بھی دخل ہے۔ ان کے مطابق علم کا حصول وحی اور الہام کے علاوہ مشاہدات اور عقل سے بھی ہوتا ہے۔ وہ خدا کا وجود عقلی دلیلوں سے ثابت کرنا چاہتے تھے اور قرآنی آیات کی تاویل و تشریح بھی علم اور منطق کی روشنی میں کرتے تھے۔ اسی طرح وہ احادیث و روایات کو بھی مستند اور غیر مستند کے درجوں میں بانٹتے تھے۔ المامون، المعتصم اور الواثق کے شاہی درباروں میں معتزلہ طرزِ فکر کو سرکاری سرپرستی اور تحفظ حاصل تھا۔ شہزادے، منصف، اساتذہ، طبیب، ماہرِ فلکیات، تاجر و غیرہ غرضیکہ سلطنت کے تمام بارسوخ افراد اس فکر کے قائل تھے۔ رواداری اور آزاد خیالی کے اس ماحول نے بغداد کو دنیا کے تمام علوم کا مرکز بنا دیا تھا۔

سوال نمبر 3:

جواب:

1930ء تک اکثر مسلمانان ہند آزادی کے صورت میں ہندوں کے ساتھ ایک متحد مملکت میں رہنے کا خیال رکھتے تھے جیسا کہ وہ صدیوں سے رہتے آئے تھے اور یہی خیال ہندوؤں کا بھی تھا جو خود مختار حکومت کا مطالبہ کر رہے تھے [108]. اس کے علاوہ کچھ قوم پرستانہ بنیادوں پر بھی تجاویز بنائی گئی تھیں. 1930ء میں خطبہ الہ آباد میں سر محمد اقبال نے مسلمانوں کے لیے ایک علاحدہ ریاست کا مطالبہ کیا. چوہدری رحمت علی نے 1933ء میں ایک اعلامیہ پاکستان نامی پمفلٹ شائع کی جس میں انہوں نے وادی سندھ کی جانب موجود علاقوں اور دیگر ہندوستانی مسلم اکثریتی علاقوں کو پاکستان کا نام دیا [109]. جناح اور اقبال 1936ءاور1938 ء میں ملاقات کرتے رہے اور جناح نے اپنی تقاریر میں اقبال کے خواب کی حمایت کی.[110]

اگرچہ تمام کانگریسی رہنما ایک متحد طاقتور ملک کے لیے کام کر رہے تھے، کچھ مسلم رہنما جن میں جناح بھی شامل تھے، اس کے مخالف تھے. وہ ان نظریات کی حمایت اپنی مسلک کے حقوق کی تحفظ کے یقین دہانی نا مل سکنے کے سبب کر رہے تھے. [108]اگرچہ تمام کانگریسی رہنما ایک متحد طاقتور ملک کے لیے کام کر رہے تھے ،کچھ مسلم رہنما جن میں جناح بھی شامل اس کے مخالف تھے وہ ان نظریات کی حمایت اپنی مسلک کے حقوق کی تحفظ کے یقین دہانی نا مل سکنے کے سبب کر رہے تھے. اس کے علوہ کچھ مسلم سیاست دان کانگریس کے ہم خیال بھی تھے ان سب کے باوجود اس منظر میں ایسے کئی ہندو سیاست دان بھی تھے جو آزادی کی صورت میں ہندوستان کو ہندو ریاست کے طور پر دیکھنا چاہتے تھے (ان سیاست دانوں میں ولبھ بھائی پٹیل اور مدن موہن مالویا جیسے شامل تھے) ان کے نزدیک آزاد ہندوستان میں گائے کی قربانی پر پابندی اور ہندی کو سرکاری زبان کا درجہ ملنا تھا. ہندو نواز کالم نگاروں کو روکنے سے قاصر کانگریسی حمایتی مسلمانوں کو کئی طرح کے خدشات کو سامنا کرنا پڑا. پھر بھی 1937ء تک کانگریس کے حمایتی مسلم تعداد قابل قدر حالت میں تھی.[111]

ان دو گروہوں میں مزید جدائی سامنے آئی جب یہ دونوں جماعتیں 1937ء کے انتخابات میں متحدہ صوبوں میں اتحادی جماعت بنانے میں ناکام نظر آئے. [112]مورخ آیان ٹالبوٹ لکھتے ہیں" کانگریس کی صوبائی حکومتوں نے مسلم آبادی کو سمجھنے اور ان کے مذہبی حساسیت کو احترام کرنے کے لیے کوئی بھی اقدام نا اٹھائے. جبکہ اس دور میں مسلم لیگ مسلمانوں کے حقوق کا دعویٰ کرتی تھی. اور بڑی بات یہ کہ مسلم لیگ نے اسی کانگریسی حکومتی ادوار کے فورا بعد پاکستان کا مطالبہ اٹھایا. "[101]"

بالراج پوری اپنے جریدے کو لکھے گئے مضمون میں جناح کے بارے میں لکھتے ہیں کہ ،" 1937ء کے ووٹ کے بعد مسلم لیگ کے صدر کی توجہ تقسیم کی طرف گئی". [113]تاریخ دان اکبر صلاح الدین احمد کی تجویز ہے کہ ان ادوار میں جناح کو کانگریس سے مزید مفاہمت کرنا بے سود لگ رہا تھا نیز ان دنوں وہ اسلامی تشخص کے بھی گرویدہ ہوتے چلے گئے تھے اور یہی ان کے نزدیک ایک الگ ،کافی اور مکمل پہچان تھی اور یہ بات ان کی اگلی زندگی سے بھی جھلکتی رہی. 1930 [22]کے بعد سے وہ مشرقی لباس زیب تن کیے دکھائی دینے لگے تھے[114]. 1937کے الیکشن کے بعد جناح کا مطالبہ تھا کہ طاقت کی تقسیم کو پورے ہندوستان میں نافظ کیا جائے اور انہیں تمام مسلمانان ہند کے واحد ترجمان کے طور پر لیا جائے.[115]

حصول پاکستان کی جدوجہد کا باقاعدہ آغاز قرار داد لاہور (1940ئ) سے ہوتا ہے. علامہ اقبال اس سے دو سال قبل1938ءہی میں فوت ہو چکے تھے. اس اعتبار سے پاکستان کی تحریک اور اس کے حصول کی سات سالہ جدوجہد میں بظاہر علامہ اقبال کا کوئی کردار نظر نہیں آتا لیکن یہ بات تسلیم کرنی پڑے گی کہ براعظم کی ملت اسلامیہ کی بھلائی، بیداری اورآزادی کے سلسلے میں اقبال کا ذہن ابتدا ہی سے بہت صاف تھا. ایک آزاد مسلم مملکت مینوہ ہندوستان کو اسلام کا گہوارہ بنانے کے آرزو مند تھے.... لکھتے ہیں:

مسلمان ہونے کی حیثیت سے انگریز کی غلامی کے بند توڑنا اور اس کے اقتدار کا خاتمہ کرنا ہمارا فرض ہے اور " اس آزادی سے ہمارا مقصد یہی نہیں کہ ہم آزاد ہو جائیں بلکہ ہمارا اول مقصد یہ ہے کہ اسلام قائم رہے اور مسلمان طاقت ور بن جائیں۔

علامہ مرحوم کی انہی دو آرزوؤں کو بعد میں تحریک پاکستان کا نام ملا جو آخر کار قیام پاکستان پر منتج ہوئی۔

علامہ اقبال نے اگرچہ عملی سیاست میں بھرپور حصہ نہیں لیا لیکن ان کے دل میں آزادی کی تڑپ موجود تھی جس کیلئے ان کا نظری اور فکری حصہ بمقابلہ عملی اور سیاسی رول کے بہت نمایاں ہے۔
تحریک پاکستان کے پہلے اور ابتدائی مرحلے میں اقبال نے مسلمانوں کو ان کا مسلمان ہونا یاد دلایا۔ ان کی اس دور کی شاعری اور نثر میں مسلمانوں کے شاندار ماضی کے تذکرے اور عظمت رفتہ کے قصے ملتے ہیں

ملت کے اندر احساس زیاں کے خاتمے کا ایک بڑا سبب مغرب کی فکری اورمادی غلبہ و استیلا تھا۔بیسویں صدی کے آغاز میں جب سلطنت برطانیہ پر سورج غروب نہیں ہوتا تھا اور بحیثیت مجموعی یورپی استعمار پوری دنیا پر اپنے استبدادی پنجے گاڑے ہوئے تھا۔ اقبالؒ مسلمانوں کے تعلیم یافتہ طبقے کے دل و دماغ سے انگریزی پرستی اور اسلام کے بارے میں ان کے معذرت خواہانہ رجحانات کو کھرچ کھرچ کر صاف کر رہے تھے۔ ان کی پوری شاعری اس کی آئینہ دار ہے۔
شب گریزاں ہو گی آخر جلوۂ خورشید سے

یہ چمن معمور ہو گا نغمہ توحید سے

اس کے ساتھ ہی علامہ نے اسلام کے حقیقی تصور کو اجاگر کیا جس میں دین و سیاست کی ہم آہنگی سب سے اہم نکتہ تھا۔ دین کے جامد تصورات کا طلسم ٹوٹ گیا۔ اقبال کے طرز فکر نے ان کے ہاں ملی تشخص کو اور گہرا کر دیا جس کی نشان دہی1876ء میں سر سید احمد خاں نے کی تھی۔ مسلم لیگ کے نزدیک ا بھی دو قومی نظریہ ایک قابل مصالحت چیز تھی۔ اسی لئے 1927ءکی دہلی تجاویز میں مسلم لیگ بھی جداگانہ انتخاب کے اصول سے (مشروط طور پر) دستبردار ہو گئی تھی۔
چنانچہ الہ آباد میں مسلم لیگ کے سالانہ اجلاس منعقدہ دسمبر1930ءمیں علامہ کے کام کا تیسرا مرحلہ شروع ہوتا ہے اس مرحلے میں علامہ نے ہندوستانی مسلمانوں کے لئے ایک الگ مملکت کا مطالبہ پیش کیا۔ اس تاریخی خطبے میں علامہ اقبال نے فرمایا:

"ہندوستان کی سیاسی زندگی نے ایک نہایت نازک صورت اختیار کر لی ہے.... اسلام پر ابتلا و آزمائش کا ایسا سخت وقت نہیں آیا جیسا کہ آج درپیش ہے۔ .... مسلمانوں کا مطالبہ کہ ہندوستان میں ایک اسلامی ہندوستان قائم کیا جائے، بالکل حق بجانب ہے.... میری خواہش ہے کہ پنجاب، صوبہ سرحد، سندھ، بلوچستان کو ایک ہی ریاست میں ملا دیا جائے۔ خواہ یہ ریاست سلطنت برطانیہ کے اندر حکومت خود اختیاری حاصل کرے خواہ اس کے باہر.... مجھے تو ایسا نظر آ تا ہے کہ اور نہیں تو شمالی مغربی ہندوستان کے مسلمانوں کو آخر ایک منظم اسلامی ریاست قائم کرنی پڑے گی۔ ہندوستان دنیا کا سب سے بڑا اسلامی ملک ہے اور اگر ہم یہ چاہتے ہیں کہ اس ملک میں اسلام بحیثیت ایک تمدنی قوت کے زندہ رہے تو اس کےلئے ضروری ہے کہ وہ ایک مخصوص علاقے میں اپنی مرکزیت قائم کر سکے.... میں صرف ہندوستان اور اسلام کی فلاح و بہبود کے خیال سے ایک منظم اسلامی ریاست کا مطالبہ کر رہا ہوں...."

مسلمان جب چھ سات برس سے شدید انتشار اور مایوسی کا شکار تھے۔ مسٹر جناح کی غیر حاضری میں الہ آباد میںدسمبر1930ءمیں منعقدہ سالانہ اجلاس نے ان میں نئی روح پھونکی۔ اس زمانے میں عام طور پر اکثر و بیشتر

ایسے مسلمان نمائندے منتخب کئے جاتے تھے جو پنشن یافتہ ہوتے یا خطاب یافتہ ہوتے .عاشق حسین بٹالوی کے عوام کے ساتھ کوئی ربط و ضبط ''تھی جس کا پنجاب کے ''مسلمانوں کے بالائی طبقوں کی ایک جماعت ''بقول . علامہ دو سال سے مستقلاً بیمار چلے ''نہیں تھا اور اکثر و بیشتر لوگ، اس کے نام اور کام سے بالکل نا آشنا تھے آ رہے تھے 1936 میں قائداعظم لاہور تشریف لائے تو ان کی درخواست قبول کرتے ہوئے علامہ اقبال نے پنجاب لیگ کی صدارت قبول کر لی اور قائداعظم کو اپنے پورے تعاون کا یقین دلایا.شاید آج اس کا اندازہ نہ لگایا جا سکے کہ علامہ کا یہ اقدام مسلم لیگ اور تحریک پاکستان کے لئے کس قدر تقویت کا باعث بنا مگر یہ حقیقت ہے کہ پنجاب میں مسلم لیگ کے تعارف اور (بعد ازاں) مطالبہ پاکستان کی مقبولیت میں اقبال کے نام کو ایک کلید کی حیثیت حاصل تھی۔ پنجاب مسلم لیگ کے لئے اپنی وفات سے پہلے دو سال تک علامہ نے جس توجہ، دلچسپی اور جوش و خروش کے ساتھ پارٹی تنظیم اور تحریک پاکستان کے لئے کام کیا، ان کی افتاد طبع اور بیماری کو دیکھتے ہوئے حیرت ہوتی ہے کہ ان کے اندر ایسی تندہی اور مستعدی کہاں سے آ گئی تھی۔
بہت سی سازشیں ہوئیں، ایک سازش کے نتیجے میں قائد کے دست راست اور پہلے وزیراعظم خان لیاقت علی خان کو لیاقت باغ (نام بعد میں رکھا گیا) راولپنڈی میں جلسے کے دوران شہید کردیا گیا۔ انھیں شہید کرنا والا افغان باشندہ تھا۔یہ سازش آج تک بے نقاب نہیں ہو سکی کیونکہ بات اندر تک پہنچ گئی تھی لہٰذا کیس دبا دیا گیا۔ بعد میں جس طرح خواجہ ناظم الدین کی حکومت کا خاتمہ ہوا اور پھر وہی ہوا جس کا شاید تصور بھی قائد کے پاکستان میں نہیں تھا، یعنی مارشل لاء۔ پھر دوسرا اور پھر تیسرا مارشل لاء لگ گیا۔ اور پھر دیکھتے ہی دیکھتے سیاستدانوں کی ایک ایسی کھیپ تیار ہو گئی جنھیں آمر نے پیدا کیا ہوا۔

خیر یہ تو سیاسی باتیں تھیں، پاکستان میں سیاست اور کرکٹ دونونکے مستقبل کے بارے میں بڑے سے بڑا تجزیہ کار بھی غلط ثابت ہوتا آیا ہے۔ مگر یہ کیا؟ ہم نے اپنے قومی پرچم جس میں سفید سبز رنگ ہے کی بے حرمتی کر دی!بلکہ کر رہے ہیں، قائد اعظم نے 11اگست والی تقریر کے بعد ہونے والے اجلاس ہی میں جس قومی پرچم کی منظور ی دی تھی اور کہا تھا کہ سفید رنگ اقلیتوں کی آزادی کی علامت ہے۔ لگتا ہے آج ہم نے اس خیال کو ہی غرق کر کے رکھ دیا ہے۔ اس لیے اگر اقلیتوں کے حوالے دیکھا جائے تو قائداعظم کے پاکستان اور آج کے پاکستان میں زمین اور آسمان کا فرق ہے۔

الغرض قائد نے جس پاکستان کا خواب دیکھا تھا آج سب کچھ اس کے برعکس ہو رہا ہے۔ آپ ؒ پاکستان کے قیام تمام گروہوں کو شامل کرکے چلنے کی پالیسی پر ''پاکستان''کے بعد محض 13ماہ زندہ رہے۔ ان کی زندگی میں تو گامزن رہا، مگر آج ہم کیا کررہے ہیں، کسی سے ڈھکا چھپا نہیں ہے ۔ ملک میں تین دفعہ مارشل لاء لگا۔ مگر دھڑلے سے لگایا گیا اور آج بھی ویسے ہی حالات پیداکرنے کی کوشش کی جارہی ہے۔

بات تو سچ ہے مگر بات ہے رسوائی کی

پھر آپ یہ دیکھیں کہ قائد کے پاکستان میں چائے بسکٹ کا خرچ بھی وزراء جیب سے ادا کرتے تھے، مگر آج وزراء ہاؤسز، گورنر ہاؤسز، صدارتی محل اور بیشتر کیمپ آفسز کا سالانہ خرچ ہی اربوں روپے بنتا ہے۔ قائد کے پاکستان میں پروٹوکول کے نام پر عوام کو تنگ کرنا ،عوام کی تضحیک سمجھا جاتا تھا جیسے ایک مرتبہ گل حسن نے آپ کی گاڑی گزارنے کے لیے ریلوے کا پھاٹک کھلوا دیا تھا، آپ کا چہرہ غصے سے سرخ ہو گیا، پھاٹک بند قائد کے پاکستان ''اگر میں ہی قانون کی پابندی نہیں کروں گا، تو پھر کون کرے گا؟''کرانے کا حکم دیا اور فرمایا میں سفارشی کلچر نہیں تھا ، زیارت ہی میں ایک نرس نے تبادلے کی سفارش کی مگر آپ نے اداس لہجے میں .قائد کے پاکستان میں اداروں کا احترام ''سوری بیٹی! یہ محکمہ صحت کا کام ہے گورنر جنرل کا نہیں''جواب دیا بھی کیا جاتا تھا، ایک واقعہ میں آپ نے وزارتِ خزانہ سے تحریری معذرت کی اور اپنا حکم منسوخ کر دیا۔

کے Look Busy Do Nothing الغرض قائد کے 13ماہ ہمارے 73سالوں پر غالب نظر آتے ہیں، آج ہم سب محاورے پر چل رہے ہیں ، ہم مذہبی طور پر خود کو سب سے زیادہ مذہبی کہتے ہیں مگر مذہبی ہیں نہیں، ہم قانون کی پاسداری کی بات کرتے ہیں، لیکن یہ محض ایک دکھاوا ہے۔ ہم ہیومن رائٹس کی بات کرتے ہیں لیکن کسی کو اُس کا حق دینے کے لیے تیار نہیں ، ہم بات بات پر کہتے ہیں کہ ملاوٹ نہ کرو، اس حوالے سے قرآن و حدیث کی باتیں کرتے ہیں مگر خود اس پر عمل کرنے سے گریزاں ہیں۔ اب صرف نوٹ والا قائد باقی ہے اور وہ اگر گندا ہو جائے تو دکان دار بھی نہیں لیتا اور خریدار بھی نہیں۔

سفر لمبا ہے کم سے کم ابتدا اس سے کر لیجیے کہ آج جب قوم اور ملک ایک مشکل دور سے گزر رہی ہے تو ہمیں یہ سوچنے کی ضرورت ہے کہ قائد اعظم کے پیش نظر پاکستان کے قیام کا مقصد کیا تھااور ان کے تصورات کے مطابق پاکستان کا نظام اور پاکستان کی قومی زندگی کی اہمیت کیا ہونی چاہیے تھی؟ہم سب کو اپنے ذاتی مفادات کو بالائے طاق رکھتے ہوئے پاکستان کی تعمیر وترقی اور استحکام کے لیے اپنی صلاحیتوں کو صرف کرنا ہوگا۔

یہی راستہ ہے قائداعظم کے نظریے اور تصورات کو عملی جامہ پہنانے کا،بات اقلیتوں کی نہیں ہے، بات ہے مساوی حقوق کی ،بات ہے مساوی قانون کی، جو قانون ایک عام شہری کے لیے بنایا گیا ،کیا اس پر عمل کرنا صدر پاکستان کی توہین ہے؟ ہم سب آج سندھی، بلوچی، پنجابی اور پختون کا پاکستان علیحدہ کرنے کی کوشش میں ہیں جب کہ ضرورت انسانیت اور پاکستان کا حق ادا کرنے کی ہے۔بابائے قوم کا مقصد اس ملک کو قید خانہ بنانا نہیں تھا، آزادی کے باوجود ہم مذہب اور سیاست کے پنجرے میں قید ہینجہاں سے ہمیں آزاد ہو کر پاکستان کو بدلنا ہوگا!